پروفیسر خواجہ عبدالحمید یزدانی

مثنوی رومی کی دعائیں

دعا عربی کا لفظ اور باب "نصر ینصر" سے ہے جس کے لغوی معنی بلانے، پکارنے، رغبت کرنے، منسوب کرنے، نام رکھنے اور کسی کام کی طرف لے جانے کے ہیں۔ اس کے علاوہ عبادت کرنے اور مدد طلب کرنے کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی خدائے بزرگ و برتر سے استمداد و استغاثہ کے ہیں، خواہ یہ استغاثہ و استمداد اپنے یا کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔ اللہ تعالیٰ سے دعا تین طرح سے ہوتی ہے، اس کی توحید بیان کرنا اور اس کی حمد و ثنا کرنا، اس کی ذاتِ باری سے عفو و درگزر اور رحم و کرم کی درخواست کہ جس سے اس کا قرب میسر آئے اور تیسرے دنیا کی بھلائی کی درخواست کرنا تہلیل و تحمید بھی دعا ہی کے زمرے میں آتی ہے کہ یہ بھی ایک ذریعہ ہے اللہ جل شانہٗ سے حصولِ جزا کا۔ اکثر احادیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں دعا کی فضیلت و اہمیت کی وضاحت ملتی ہے اور اسے عبادت کہا گیا ہے۔ ہر قسم کی دعا، جس میں قضائے حاجات کے لیے دعا بھی ہے، صرف اللہ ہی سے کی جانی چاہیے۔ غیر اللہ سے دعا کرنا نہ صرف بہت بڑی گمراہی بلکہ شرک عظیم اور کفر ہے۔ دعا میں ہمیشہ ایک باضابطہ استدعا کا تصور شامل ہوتا ہے، چاہے یہ دعائے خیر ہو یا دعائے بد۔ حالات کے مطابق دعا، یعنی خدا سے استدعا کرنا، کئی طرح کی ہو سکتی ہے اور اس لحاظ سے دعا کا ترجمہ ذاتی التجا کرنا بھی ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں دعا کی بڑی اہمیت ہے۔ متقی مسلمانوں کے نزدیک دعا، انسان اور کرۂ سماوی کے درمیان رابطہ نہیں بنتی بلکہ اصل رابطہ براہِ راست دعا کرنے والے اور خدا کے درمیان ہے۔

ابتدائی فارسی مثنویوں میں دعا کا عنصر بہت کم ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو کسی خاص موقع پر ہی نظر آتا ہے۔ فارسی مثنوی نگاروں میں سب سے پہلے غالباً نظامی گنجوی نے مثنوی میں، اور وہ بھی اس کے آغاز ہی میں باقاعدہ مناجات یا دعا کا باب قائم کیا۔ اس سے قبل کسی فارسی مثنوی میں ایسا باب دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس لحاظ سے نظامی اس روایت کا بانی قرار پاتا ہے۔ بعد میں خمسۂ نظامی کی پیروی میں لکھی جانے والی تمام مثنویوں میں یہ روایت بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔ نظامی کی تین مثنویوں میں

مناجات کا الگ کوئی باب نہیں ہے بلکہ آغاز ہی میں دعا ہے یا ثنا کے بعد دعائیہ اشعار ہیں۔ البتہ سکندر نامہ میں ایک باب ہے اور مخزن اسرار میں دو باب قائم کیے گئے ہیں۔ خمسۂ نظامی کا جواب لکھنے والوں نے جہاں اس روایت کو پورے طور پر نبا ہا وہاں اس میں کچھ اضافہ بھی کیا، یعنی مناجاتِ اوّل اور مناجاتِ دوم کے علاوہ مناجاتِ سوم اور مناجاتِ چہارم کے بھی باب قائم کیے۔ مثلاً خسرو کی مثنوی مطلع الانوار میں مناجات کے تین باب اور جامی کی تحفۂ احرار میں چار ابواب ہیں، جب کہ خواجوی کرمانی نے گوہر نامہ میں حمدِ باری اور نعتِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد مناجات کا باب رکھا ہے۔

مولانا رومی نے اس ضمن میں کسی قسم کی تقلید سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنا انداز برقرار رکھا ہے۔ ان کی مثنوی میں جتنی دعائیں ہیں، ان میں سے چند ایک تو قرآنی ہیں جن کا ذکر کسی خاص مناسبت سے آگیا ہے، اور کچھ موقع و محل کے مطابق کسی شخص کی یا خود مولانا کی اپنی ذات کے لیے ہیں۔ ان میں اگر کہیں خدائے بزرگ و برتر سے بخشش و مغفرت کی استدعا ہے تو کہیں، بلکہ زیادہ تر، نفس امارہ کی دست برد سے محفوظ رکھنے کی التجا کی گئی ہے، کہیں دعا، ظالموں اور ستم کاروں کے خلاف حضورِ حق فریاد و فغان کی صورت میں نظر آتی ہے، اور کہیں خود مولانا کسی دوسرے آدمی کو کسی پریشان کن صورت حال سے نجات پانے کے لیے دعا کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہیں یہ دعا مناجات کی صورت میں نظر آتی ہے۔

دفتر اوّل میں ایک یہودی بادشاہ کی حکایت بیان ہوئی ہے جو نصاریٰ کو اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر قتل کروا دیا کرتا تھا۔ اس کے مکار وزیر نے اسے اس قتلِ عام سے روکا کہ بقول اس کے نصاریٰ ڈر کے مارے اپنی مذہبی وابستگی چھپانے لگے تھے۔ اس کا حل اس نے اس بات میں تلاش کیا کہ ان میں باہم پھوٹ ڈال دی جائے تاکہ اس طرح وہ اپنے آپ ہی ختم ہو جائیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کی تجویز کے مطابق وزیر کو برسرِ دربار ذلیل کیا، اور وہ ترکِ دربار کر کے نصرانیوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے خود کو عیسائیت کا مبلّغ ظاہر کر کے اس کا پرچار شروع کر دیا۔ نصرانی اس وزیر سے متاثر ہو کر اس کی طرف متوجہ ہونے لگے ... غرض وزیر کا جادو چل جاتا ہے، نصاریٰ اس کے انتہائی عقیدت مند بن جاتے اور اسے نائبِ عیسیٰ کہنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ دجال محض تھا ... دجال کے ذکر کے بعد مولانا پُر درد انداز میں ان نت نئی رکاوٹوں اور مشکلوں کا تذکرہ اور ان سے نجات کی دعا کرتے ہیں، جو نفسِ امارہ قدم قدم پر حرص و ہوس اور ایسی ہی دوسری صورتوں میں انسان کے راستے میں پیدا کرتا رہتا ہے۔

اس نفس نے ہزاروں دام و دانہ پھیلا رکھے ہیں اور آدمی حریص پرندے کی مانند، اپنی تمام تر عظمت کے باوجود ہر لحظہ اس کے ایک نئے دام میں پھنس رہا ہے۔ مولانا نے اس سلسلے میں اللہ جل شانہ کی عنایاتِ پیہم اور انسان کی بے بسی اور جگر گداز مجبوری کا ذکر کر کے نفس کے ہاتھوں انسانی اعمال کے ضیاع کو انبارِ گندم اور چوہے کی سیدھی سادی روزمرہ کی تمثیل سے واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ادھر ہم گندم کا انبار لگاتے جاتے ہیں، ادھر یہ انبار اندر ہی اندر ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا دھیان اس طرف آتا ہی نہیں اور نہ ہم اس پر غور کرنے کی کوشش ہی کرتے ہیں کہ ہماری اس گندم کو چوہا بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ختم کیے جا رہا ہے۔ اس چوہے (نفس) نے ہمارے انبارِ اعمال میں نقب لگا کر اُسے کمال مکاری سے ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شیطانی وساوس آداب عبادت کی بجاآوری سے مانع آتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے حضور اکرمؐ سے نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بارے میں سوال کیا تو سرورِ کونینؐ نے فرمایا یہ ایک جھپٹا ہے کہ شیطان بندے کی نماز میں سے جھپٹ لیتا ہے۔[ل۵] مولانا کے مطابق ضروری ہے کہ انسان پہلے اس نفس کے شر کو دور کرے، پھر اعمال کی طرف متوجہ ہو۔

مولانا فخرِ موجودات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیثِ مبارکہ "حضوری کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی" کا حوالہ دے کر مذکورہ بالا تمثیل کو آگے بڑھاتے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دستِ دعا بلند کرتے ہیں۔ اس دعا میں نفسِ شوم کے مکر سے بچنے کے لیے اس ذاتِ اقدس کی عنایات والتفات کی بالواسطہ طور پر التجا کی گئی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر تیری عنایات ہمارے شاملِ حال ہو جائیں تو اس دزدِ لئیم یعنی نفس کا کیا ڈر۔ تیری ذاتِ پاک اگر ہم پر توجہ و التفات فرما دے تو اس نفس کی طرف سے ہر ہر قدم پہ ہزاروں دام بچھائے جانے پر بھی ہمیں ذرہ بھر پروا یا پریشانی نہ ہوگی:

او بسرِ دجالِ یک چشم لعین — امی خدا فریاد رس نعم المعین

صد ہزاران دام و دانہ است ایخدا — ما چو مرغانِ حریصِ بینوا

دمبدم پا بستۂ دامِ نویم — ہر یکی گر باز و سیمرغی شویم

ل۵ احادیثِ مثنوی، ص ۱۱

می رہانی ہر دمی مارا و باز — سوی دامی میرویم ای بی نیاز
ما درین انبار گندم می کنیم — گندم جمع آمدہ گم می کنیم
می نیندیشیم آخر ما بہوش — کاین خلل در گندمست از مکر موش
موش تا انبار ما حفرہ زدست — وز فنش انبار ما ویران شدست
اقل اے جان دفع شر موش کن — وآنگہ اندر جمع گندم جوش کن
بشنو از اخبار آن صدر صدور — لاصلوٰۃ تمّ الّا بالحضور
گر نہ موشی دزد در انبار ماست — گندم اعمال چل سالہ کجاست
ریزہ ریزہ صدق ہر روزہ چرا — جمع می ناید در این انبار ما
چون عنایاتت شود با ما مقیم — کی بود بیمی از آن دزد لئیم
گر ہزاران دام باشد ہر قدم — چون تو با مانی نباشد ہیچ غم[۵۲]

اسی دفتر میں ایک شیر اور جنگلی جانوروں کی لمبی چوڑی تمثیل بیان ہوئی ہے، جس میں جانور شیر سے اپنی جان بچانے کی خاطر اسے قناعت و توکل کا درس دیتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ انہی جانوروں میں ایک خرگوش بھی ہے جو اپنی عیاری سے شیر کو ایک کنوئیں پر لے جانے اور اُسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ کنوئیں میں ایک اور شیر چھپا بیٹھا ہے جو اس کا دشمن ہے، اور یوں شیر کنوئیں میں اپنا ہی عکس دیکھ کر چھلانگ لگا دیتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ اس تمثیل کے آخری حصے میں مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس کسی نے دشمن کی بات پر یقین کیا اس کا حشر اس شیر ایسا ہی ہوا۔ دشمن اگر محبت اور دوستی کی بھی بات کرے تو اسے دام ہی سمجھنا چاہیے۔ اس کی قند بھی زہر ہی ہوگی۔ لیکن جب مقدر ہی میں ایسا معاملہ ہو تو انسان، دوست اور دشمن میں تمیز کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں مولانا کے مطابق، اللہ کے حضور گریہ و زاری اور عجز و نیاز سے کام لیتے اور تسبیح و روزہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے دعا کرنی چاہیے ... یہاں مولانا نے جو دعا تلقین فرمائی ہے اس میں اللہ جل جلالہٗ کو علام الغیوب، کریم الغفو اور ستار العیوب ایسی صفات سے خطاب کرتے ہوئے اسی درد بھرے اور پُر تاثیر لہجے میں مکر بد کے پتھر

---

۵۲ کتاب مثنوی۔ ص ۱۱

کے نیچے کچلے جانے سے محفوظ رکھنے، گناہوں کی سزا نہ دینے اور تمام موجوداتِ کائنات کی صحیح صورت دل پر ظاہر کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ پھر اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کو کُتا پن اور نفس کو شیر قرار دے کر کہا گیا ہے کہ ہم سے اگر لغزشیں سرزد ہوئی ہیں تو ان کی وجہ سے اس نفس کو ہم پر مسلط نہ فرما حقیقتِ اشیا اور صحیح صورت حال ہم پر واضح فرما تاکہ خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر ہم کہیں غلط کو صحیح اور مضر کو مفید نہ سمجھ بیٹھیں۔ جو کوئی تیرے قہر کا مظہر بنتا ہے وہ "نیست" (فانی) ہوتے ہوتے بھی ہستی و خود پسندی کا شکار ہو کر ظلم و تعدی کا بازار گرم کرتا اور کسی کی نصیحت سننے کو تیار نہیں ہوتا۔

چون قضا آید نہ بینی غیر دوست — دشمنان را باز نشناسی ز دوست
چون چنین شد ابتہال آغاز کن — نالہ و تسبیح و روزہ ساز کن
نالہ میکن کای تو علّام الغیوب — زیر سنگِ مکر بد مارا مکوب
یا کریم العفو ستار العیوب — انتقام از ما مکش اندر ذنوب
آنچہ در کونست زاشیا و آنچہ ہست — وانما جان را بہر حالت کہ ہست
گر سگی کردیم ای شیر آفرین — را مگمار بر ما زین کمین
آب خوش را صورت آتش مدہ — اندر آتش صورت آبی منہ
از شراب قہر چون مستی دہی — نیست ہا را صورت ہستی دہی[۵۳]

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے مولانا نے دو فرشتوں کی دعا اور اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ اس کی دعا میں ربِ کریم سے اصحابِ انفاق کے لیے اجرِ عظیم اور ان کے مال میں خیر و برکت اور بخیلوں کے لیے تباہی و بربادی اور زیان و نقصان کی درخواست کی گئی ہے۔ یہاں صاحبِ انفاق سے مراد مجاہدِ راہِ حق ہے، نہ کہ نفسانی خواہشات پر چلنے والا مُسرف۔ اس دعا کے سلسلے میں حضرت بحر العلوم کا کہنا ہے کہ بعض اہلِ تصوف کے نزدیک انسان میں موجود قوتِ ملکیہ ندا دیتی ہے اور یہ ندا ہر شخص میں ہر وقت ہوتی ہے، اسے صرف گوشِ دل ہی سے سنا جا سکتا ہے۔ اور انہی کے بقول، فرشتے کی یہ ندا عالمِ ملکوت ہی میں ہوگی، کیونکہ اگر اس دنیا میں ہوتی تو ہر کوئی اُسے سن لیتا۔ اس ضمن میں انھوں

---

۵۳ کتاب مثنوی، ص ۳۲، ۳۳ — مثنوی معنوی ص ۱/۱۴۵ — بحر العلوم، جلد ۱/۸۲

نے حضرت جبرئیل کی مثال دی ہے کہ جب وہ انسانی شکل اختیار کر کے حضورؐ کے پاس آئے اور ایمان و اسلام کے بارے میں حضور اکرمؐ سے سوال کیا تو اس دنیا میں ہونے کی وجہ سے تمام حاضرین نے ان کی نداسن لی۔[۵۴]

گفت پیغمبرؐ کہ دائم بہر پند — دو فرشتہ خوش منادی می کند

کای خدایا منفقان را سیر دار — ہر درمشان را عوض دہ صد ہزار

ای خدایا ممسکان را در جہان — تو مدہ الّا زیان اندر زیان

ای خدایا منفقان را دہ خلف — ای خدایا ممسکان را دہ تلف

منفق و ممسک محل بین بہ بود — چون محلّ باشد موثر می شود[۵۵]

دفتر دوم میں ایک مفلس قیدی کی داستان بیان ہوئی ہے۔ اس کے آخر میں صانع حقیقی کی کاری گری کے ذیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ گویا اس کی ایجاد کا تعلق عدم اور نیستی سے ہے۔ اس بنا پر مولانا "نیستی" کی طرف مائل ہونے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ بقائے حق میں فنا ہو کر ابدیت و بقا حاصل ہو سکے۔ اسی تلقین یا خیال کے پیش نظر وہ خدا کی طرف رجوع کرتے اور مشغولِ دعا ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ دعا "فی المناجات" کے ۱۰، ۱۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ شروع کے چند اشعار میں یہ دعا اپنے اصطلاحی معنوں میں نظر آتی ہے اور باقی اشعار میں اس لاثانی و لافانی کی بعض صناعیوں کا ذکر ہے۔ اس دعا میں خدائے پاک کو وحدہٗ لاشریک کہہ کر اس سے دست گیری کرنے، گناہوں سے درگزر فرمانے اور ایسی باتیں سکھانے کی عاجزانہ التجا کی گئی ہے، جو اس کی رحمت کے حصول کا سبب بن سکیں۔

---

۵۴ حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے (اور یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں آئی ہے) کہ ہم حضور اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص اُجلے سفید کپڑے پہنے (سیاہ بالوں والا) سرورِ کونینؐ کے پاس آیا اور حضورؐ کے زانو سے زانو ملا کر اور اپنی دونوں ہتھیلیاں حضورؐ کے زانو پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس پر نہ تو سفر کا کچھ اثر معلوم ہوتا تھا جو اُسے مسافر سمجھا جاتا اور نہ ہم میں سے کوئی اُسے پہچانتا ہی تھا۔ اس نے نبی کریمؐ سے اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں دریافت کیا جس کا حضور اکرمؐ نے جواب دیا۔ جب وہ آدمی چلا گیا تو فخرِ موجودات نے فرمایا: اے عمر تو جانتا ہے کہ یہ شخص کون تھا؟ میں کہ حیرت کے مارے چُپ تھا، بولا کہ خدا اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ یہ جبرئیل تھا تم لوگوں کو دین سکھانے آیا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتبِ احادیث)

۵۵ کتاب مثنوی، ص ۵۹ - بحر العلوم، ص ۱/۱۴۲ - مثنوی معنوی، ص ۱/۲۴۱

پھر توفیقِ خداوندی، جس کی بدولت انسان اللہ کے حضور ہاتھ پھیلا کر عفو و درگزر کی درخواست کر سکتا ہے، اجابتِ حق اور خدا کی غفاری و قہاری کا ذکر کر کے اپنی خطاؤں کی اصلاح کی گزارش کی گئی ہے، اس لیے کہ یہ بھی (اصلاح وغیرہ) اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔

ای خدای پاک بی انباز و یار — دست گیر و جرم مارا درگذار
یاد ده مارا سخنهای رقیق — کہ ترا رحم آورد آن ای رفیق
ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو — ایمنی از تو مہابت ہم ز تو
گر خطا گفتیم اصلاحش تو کن — مصلحی تو، ای تو سلطان سخن
کیمیا داری کہ تبدیلش کنی — گرچہ جوی خون بود نیلش کنی
این چنین مینا گریہا کار تست — این چنیں اکسیرہا از اسرار تست [۵۶]

دفترِ دوم ہی میں دورِ حضرت موسیٰ کے ایک گڈریے کی مناجات بیان ہوئی ہے۔ اس مناجات میں جس سیدھے سادے انداز میں خدا کو مخاطب کیا گیا ہے، اس کی نظیر کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ مناجات ایک سادہ فطرت نادان انسان کی انتہائی سادگی لیکن محبوبِ حقیقی سے بے پناہ محبت، والہانہ شیفتگی اور اخلاص کی بڑی دلکش و جاذب تصویر پیش کرتی ہے۔

گڈریے کی اسی سادگی، بالفاظِ دیگر گستاخی نے حضرت موسیٰ کو برافروختہ کر دیا اور انھوں نے اُسے ڈانٹا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ پر عتاب نازل ہوا کہ تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا۔ ہم نے ہر کسی کو الگ الگ سیرت سے نوازا ہے۔ . . یہاں مولانا کو یہ بتانا مقصود تھا کہ ادیانِ عالم کی نسبت ملت عشق کا انداز بالکل جداگانہ ہے اور عشاق کو صرف اس محبوبِ حقیقی ہی سے سروکار ہے اور بس:

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جداست — عاشقان را مذہب و ملت خداست

اب ذرا گڈریے کی دعا و مناجات ملاحظہ ہو: اے خدا تو کہاں ہے، کس جگہ ہے کہ میں تیرا چاکر بنوں، تیرا جوتا سیئوں، تیرے سر میں کنگھی کروں۔ اے خدا میری جان تجھ پر فدا ہو، میرے بال بچے میرا سب خاندان تجھ پر قربان، تو کہاں ہے؟ کہ میں تیرے اُلجھے ہوئے بال سلجھاؤں اور تیرے جوتے کو

---

۵۶ کلیاتِ مثنوی، ص ۱۲۳

ٹانکے لگاؤں، تیرے کپڑے دھوؤں، تیرے سر کی جوئیں ماروں، اے صاحبِ حشمت تیری خدمت میں دودھ پیش کروں۔ اگر تو بیمار پڑ جائے تو میں دل و جان سے تیری تیمارداری کروں، تیرے پیارے پیارے ہاتھوں کو چوموں، تیرے سندر پاؤں دباؤں اور جب تجھے نیند آنے لگے تو تیرا بستر جھاڑ پونچھ کر صاف کروں۔ اگر مجھے تیرے گھر کا پتا چل جائے تو میں تیرے لیے دودھ اور گھی لے کر پہنچا کروں۔ صرف یہی نہیں بلکہ لذیذ و دلکش دہی کے مٹکے بھی ساتھ لایا کروں۔ یہ ساری اشیا تیار کر کے میں صبح و شام تیرے پاس لایا کروں، میرا کام لانا ہو اور تیرا کام کھانا۔ اے خدا میری تمام بکریاں تجھ پر قربان ہیں، تیری یاد میں سراپا آہ و زاری ہوں :

دید موسیٰ یک شبانی را براہ   کو ہمی گفت "ای خدا و ای الٰہ
تو کجائی تا شوم من چاکرت   چارقت دوزم کنم شانہ سرت
ای خدای من فدایت جانِ من   جملہ فرزندان و خان و مانِ من
تو کجائی تا سرت شانہ کنم   چارقت را دوزم و بخیہ زنم
جامہ‌ات شویم، شپشہایت کشم   شیر پیشت آورم ای محتشم
ور ترا بیماری آید بہ پیش   من ترا غمخوار باشم ہمچو خویش
دستکت بوسم بمالم پایکت   وقت خواب آید، بروبم جایکت
گر ببینم خانہ‌ات را من دوام   روغن و شیرت بیارم صبح و شام
ہم پنیر و نان ہای روغنین   خمرہا چغرات ہای نازنین
سازم و آرم بپیشت صبح و شام   از من آوردن ز تو خوردن تمام
ای فدای تو ہمہ بزہای من   ای بیادت ہی ہی و ہیہای من[55]

اسی دفتر میں ایک بیمار صحابی کی داستان میں دو دعائیں بیان ہوئی ہیں۔ پہلی دعا خود صحابیؓ کی ہے۔ جنھوں نے اس خوف سے کہ گناہ گاروں کو روزِ قیامت شدید عذاب ہوگا، خدا کے حضور یہ التجا کی کہ انھیں جو کچھ بھی عذاب ہونا ہے اسی دنیا میں ہو جائے تاکہ آخرت میں اس سے نجات مل جائے۔ ان کی اس التجا

---

[55] کتاب مثنوی، ص ۱۴۸

کے ضمن میں ان کی زبان سے ہاروت و ماروت کی مثال بیان کی گئی ہے، جو بقول ان کے عاقل و دانا تھے کہ انھوں نے عذابِ آخرت سے بچنے کے لیے اسی دنیا میں چاہِ بابل کی قید اختیار کر لی۔ ان صحابیؓ کے مطابق ان دونوں کا یہ فعل مناسب تھا، اور وہ اس لیے کہ آگ (عذابِ آخرت) کی نسبت دھوئیں (عذابِ دنیا) کی تکلیف کم ہوتی ہے۔ یہاں دونوں جہانوں کی تکلیف و عذاب کا موازنہ کر کے دنیا میں انسان پر وارد ہونے والی تکالیف کو عذابِ آخرت سے کہیں سہل اور قابلِ برداشت بتایا گیا اور ان لوگوں کو خوش بخت کہا گیا ہے جو اسی دنیا میں عبادات وغیرہ کی تکالیف اٹھا لیتے ہیں تاکہ عالمِ آخرت میں عذاب سے بچ جائیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابی کی عیادت کے لیے تشریف لے جانے پر وہ اپنی اس دعا کا ذکر حضورؐ سے کرتے ہیں کہ میں نے محض آخرت کے عذاب سے بچنے اور وہاں ہر طرح کی فراغت پانے کی خاطر اس قسم کی دعا مسلسل کی جس کے نتیجے میں مجھے اس شدید بیماری نے آلیا... یہ دعا اس لحاظ سے عجیب بھی ہے اور اپنی نظیر آپ بھی، کہ شاید ہی کسی مسلمان نے عذابِ آخرت کے بدلے عذابِ دنیا کی خواہش کی ہو۔ البتہ ہر مسلمان عذابِ آخرت سے بچنے اور بخشش و مغفرت ہی کی دعا کرتا ہے۔ تو گویا یہ دعا ان صحابیؓ کے انتہائے خشیت و تقویٰ کی نشاندہی کرتی ہے:

ہمچو ہاروت و چو ماروت از حزن — آہ میکردم کہ "ای خلاقِ من"
از خطر ہاروت و ماروت آشکار — چاہ بابل را نمودند اختیار
تا عذابِ آخرت این جا کشند — گربزند و عاقل و ساحر وَشند
نیک کردند و بجای خویش بود — سہلتر باشد ز آتش رنجِ دود
حد ندارد وصف رنج آن جہان — سہل باشد رنج دنیا پیش آن
ای خنک آن کو جہادی می کند — بر بدن زخمی و دادی می کند
تا ز رنجِ آن جہانی وارہد — بر خود این رنج عبادت می نہد"
من ہمی گفتم کہ یارب آن عذاب — ہم درین عالم بران بر من شتاب
تا در آن عالم فراغت باشدم — در چنین درخواست تا دم میزدم
این چنین رنجوریی پیدام شد — جان من از رنج بی آرام شد[۵۵]

---

۵۵ کتاب مثنوی، ص ۱۶۶

صحابیؓ کی اس دعا پر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا اور اس قسم کی دعا مانگنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ پھر ہادیٔ برحق نے ان صحابی کو جو دعا یاد فرمائی وہ قرآنی دعا اور گویا تمام دعاؤں کا نچوڑ ہے۔ یہ دعا قرآنِ کریم میں ایک مرتبہ آئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں مومنوں کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ بعضے آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری دیجیے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچائیے۔ (آیہ ۲۰۱) اس سے قبل کفار کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ صرف دنیا ہی کی بہتری کے خواہاں ہیں، جو انھیں ملے گی لیکن آخرت میں انھیں عذاب چکھنا ہوگا۔

مولانا نے یہ دعا معمولی سے لفظی اضافے کے ساتھ بیان کی ہے، تاہم اس کا مفہوم وہی ہے جو قرآن کریم کی دعا کا ہے۔ اس کے علاوہ حضور نبی کریمؐ کی زبانِ معجز بیان سے اللہ سے مشکلیں آسان اور راہِ ہدایت کی دشواریوں کو دور فرمانے اور ہمیشہ لطف و کرم سے نوازنے کی التجا بھی ان صحابی کو سکھائی گئی ہے:

گفت پیغمبرؐ مر آن بیمار را　　　　این بگو "کای سہل کن دشوار را
آتنا فی دارِ دنیانا حَسَن　　　　آتنا فی دارِ عقبانا حسن
راہ را بر ما چو بستان کن لطیف　　　　مقصدِ ما لطفِ خود کن ای شریف[۵۹]

ان صحابیؓ کی داستان کے دوران، جو وقفوں سے بیان ہوئی ہے، شیخ بہلول اور ایک سائل کا قصہ مذکور ہوا ہے۔ شیخ بہلول نے خود کو دیوانہ ظاہر کر رکھا ہے، وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتے، لیکن کوئی شخص بعض مسائل کا حل جاننے کے لیے کسی نہ کسی بہانے انھیں گفتگو پر آمادہ کر لیتا ہے ... اس داستان کے دوسرے حصے میں مولانا نے ایک جگہ باطنی علم اور ظاہری علم و گفتار کی بحث چھیڑی اور اوّل الذکر کو بہتر قرار دیتے ہوئے اللہ جل جلالہ کو اس کا خریدار بتایا ہے۔ پھر اس علم کے طالب بننے کی تلقین کی ہے اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے خدائے بزرگ و برتر کے بے پایاں لطف و کرم اور بخشش و نوازش کا ذکر کر کے اس سے دست گیری فرمانے اور عیبوں سے درگزر فرمانے کی التجا کی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض ہوا، مولانا سب سے زیادہ نفسِ امارہ سے خوف زدہ ہیں، اس لیے جہاں بھی انھیں موقع ملتا ہے وہ انسان کے اس سب سے بڑے دشمن سے خلاصی و نجات کی خاطر اس ذوالجلال والاکرام کے حضور گڑگڑا

---

۵۹ کتاب مثنوی، صفحہ ۱۱۸

گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ان کی یہ التجا بھرپور اور رقت انگیز انداز میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے اس نفسِ امارہ کی چیرہ دستیوں کو جس پُر درد انداز اور صرف دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے، اس سے اس کے انسان پر غلبے اور بالادستی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ... نفسِ پلید کی چھری ہڈیوں تک جا پہنچی ہے۔ انسان اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ اس کے بندِ سخت میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ صرف ربِ رحیم ہی اس سے نجات دلا سکتا ہے۔ مولانا نفس کی اس زبردست گرفت کو بڑے وزنی قفل سے تشبیہ دے کر اس ذاتِ اقدس سے التجا کرتے ہیں کہ اگر تیرا فضل و کرم ہمارے شاملِ حال نہ ہو تو اس قفلِ گراں کے کھلنے کی توقع ناممکن ہے۔ پھر وہ آیتِ قرآنی "نحن اقرب الیہ من حبل الورید"[۱۱۰] کے حوالے سے کہتے ہیں کہ چونکہ تو خود ہم سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے اس لیے ہم اپنی جانب سے تیری جانب رُخ کرتے ہیں۔ یہ نفسِ امارہ اپنی مکاریوں اور فریب کاریوں سے جس طرح انسان کو اس ذاتِ خداوندی سے دور رکھتا اور جس طرح انسان اس کے ہاتھوں بے بس ہوتا چلا جاتا ہے، اس صورتِ حال کو مولانا کمال بے چارگی سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اے خدا تیرے اس قدر نزدیک ہونے کے باوصف ہم تجھ سے دور ہیں۔ پھر وہ اس صورتِ حال کو تاریکی کے مشابہ قرار دے کر خدائے لم یزال سے اسے دور کرنے اور روشنی سے نوازنے کی التجا کرتے اور اس بات کو دہراتے ہیں کہ یہ دعا تیری ہی تعلیم کردہ اور تیری ہی بخشش و عنایت ہے۔ آخر میں اس ضمن میں انھوں نے قرآنی تلمیح (آتشِ نمرود سے ...) سے استفادہ کیا ہے:

یارب این بخشش نہ حدِ کارِ ماست — لطفِ تو لطفِ خفی را خود سزاست
دستگیر از دستِ ما ما را بخر — پردہ را بردار و پردۂ ما مدر
باز خر ما را ازین نفسِ پلید — کاردش تا استخوانِ ما رسید
از چو ما بیچارگان این بندِ سخت — کہ گشاید جز تو ای سلطان بخت
این چنین قفلِ گران را ای ودود — کہ تواند جز کہ فضلِ تو کشود؟
ما ز خود سوی تو گردانیم سر — چون توی از ما بما نزدیک تر
با چنین نزدیکیی دوریم دور — در چنین تاریکیی بفرست نور
این دعا ہم بخشش و تعلیم تست — ورنہ در گلخن گلستان از چہ رست[۱۱۱]

---

۱۱۰ سورۂ قٓ آیہ ۱۶۔ اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

۱۱۱ کتاب مثنوی، ص ۱۶۵، ۱۶۶

قومِ حضرت موسیٰؑ اور اس کی پشیمانی کی داستان بیان کرتے ہوئے ایک جگہ قوم کی زبانی حضرت موسیٰ کے خشم اور حلم کا تذکرہ چھیڑا گیا ہے۔ مولانا انہی دو لفظوں کا سہارا لے کر رحمتِ ایزدی کو پکارنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دعا کیا ہے، اپنی بے انتہا کوتاہیوں، لغزشوں اور بدعہدیوں وغیرہ کا اعتراف اور اس کے جواب میں اللہ جل شانہٗ کی رحمتِ بے پایاں اور بخششِ فراواں کا تذکرہ ہے۔ گویا اس طرح اس کی رحمت کو جوش میں لانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ مولا کریم نہ صرف انسانی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے بلکہ ہر طرح کی آزمائش اور رسوائی سے محفوظ رکھے اور تاکہ شیطان کو موقع نہ مل سکے کہ وہ اسے گمراہی کی طرف لے جائے۔ یہ ساری دعا ذاتِ خداوندی کے حضور انسان کے کمالِ خضوع، انتہائے عجز و بے چارگی اور حصولِ رحمتِ باری کی کوشش کی تصویر پیش کرتی ہے۔ دیکھنے میں سادہ الفاظ اور سیدھی سادی تشبیہات و ترکیبات، لیکن دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اپنے اندر ایک جہانِ تاثیر لیے ہوئے اور دعا کنندہ کے دردِ دروں اور فریاد و فغاں کے غمّاز ہیں۔

دعا کے شروع میں اپنی عہد شکنی اور خدائے بزرگ و برتر کے ایفائے عہد کا ذکر ہے۔ عہدِ خداوندی کو سیکڑوں پہاڑوں سے بھی مضبوط تر اور اپنے عہد کو تنکے کی طرح ہلکا پھلکا قرار دیا ہے جو ہلکی سی ہوا چلنے سے بھی اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے۔ پھر التجا ہوتی ہے: بارالٰہا: اپنی اس قدرت کے صدقے میں جو تجھے ہماری نیرنگیوں اور بوالعجبیوں پر ہے، ہم پر رحمت فرما، ہم اپنے آپ کو اور اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھ چکے، اب ہمیں مزید آزمائشوں میں نہ ڈال تاکہ تیرے لطف و کرم سے ہماری دیگر رسوائیوں پر پردہ ہی پڑا رہے۔ تیری ذاتِ اقدس کی بخشش و عنایت اور لطف و عطوفت بے حد و بے پایاں ہے تو ہماری ضلالت و کج روی کی کوئی حد نہیں۔ اے کریم! اپنے اس بے اندازہ کرم کو اس بے مایہ خاک کی مٹھی کی ان گنت اور بے شمار لغزشوں اور کوتاہیوں پر غالب و مسلّط فرما۔ ہمارے لباسِ انسانی کا صرف ایک تار بچا رہ گیا ہے۔ ہم اگر شہر تھے تو اب صرف دیوار کی صورت باقی رہ گئے ہیں۔ یا سلطان عالمیاں! ہماری اس بچی ہوئی پونجی کو بچا لے، ایسا نہ ہو شیطان کو خوش ہونے کا موقع مل جائے، ہمارے لیے نہیں اپنے اس لطفِ قدیم کی خاطر جو بخشش کے لیے گناہ گاروں اور خطاکاروں کو تلاش کرتا ہے (ہماری اس پونجی کی حفاظت فرما۔ ہم نیکیوں کی تمام قوتیں فنا کر چکے ان کے فقط آثار ہی باقی رہ گئے ہیں)۔ ...

دفترِ سوم میں عہدِ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک شخص کی داستان بیان ہوئی ہے جو شب و روز خدا کے حضور یہ دعا کرتا تاکہ اسے کسی محنت و مشقت کے بغیر حلال کی روزی نصیب ہو۔ یہ دعا چونکہ خود مولانا کی بجائے کسی دوسرے شخص کی ہے اس لیے اس میں اس خلوص، رقّت، خشوع، احساسِ عجز و بے چارگی اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی فریاد و فغاں کی صورت نظر نہیں آتی جو مولانا کی اپنی دعا کا خاصہ ہے اور جسے پڑھ کر خود قاری پر مولانا کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھی ہاتھ اُٹھا کر مولانا کے ساتھ دعا مانگنے میں شریک ہو جاتا ہے۔

مذکورہ دعا کنندہ اپنی کاہلی، سستی اور دیگر نا اہلیوں اور کوتاہیوں کا ذمہ دار خدا کو ٹھہراتے ہوئے جس نے اُسے اس حالت میں پیدا کیا، خود کو ایک زخمی پیٹھ والا گدھا قرار دیتا ہے جس پر گھوڑوں اور اونٹوں والا بوجھ لادا نہیں جا سکتا۔ وہ بار بار اپنی کاہلی اور خدا کی بخشش و عنایت کا ذکر کرتا اور اپنی کاہلی کے حوالے سے روزی کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مختلف بہانوں اور مختلف مثالوں سے جوش میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خود کو زندگی بھر سائے میں سونے والا کاہل کہتا ہے جسے بخشش و لطف و عنایت کا سایہ میسر ہے۔ اس کے مطابق ذاتِ باری ایسے کاہلوں اور سایہ میں سونے والوں کو شاید کسی اور ڈھب سے روزی مہیا کرتی ہے۔ پھر وہ اس کے حضور التجا کرتا ہے کہ پاؤں والے تو خود ہی روزی تلاش کر لیتے ہیں، جن کے پاؤں نہیں ان پر رحم فرما۔ اس ضمن میں وہ بارش اور زمین کی مثال لاتا ہے۔ زمین کے پاؤں نہیں ہیں لیکن تیری رحمت تہ در تہ بادلوں کو اس کی طرف بھیجتی ہے جو بارش کی صورت میں اس کی تشنگی کو دور کر دیتے ہیں۔ دوسری مثال بچے اور ماں کی ہے۔ بچے کے پاؤں چل نہیں سکتے اس کے باوجود ماں کی وساطت سے اس تک روزی پہنچتی ہے۔ سو اے ربِ کریم! میں تو اچانک اور کسی تکلیف کے بغیر روزی کا خواہاں ہوں اس لیے کہ میرا تجھ سے اس طرح روزی مانگنا ہی میری کوشش اور جد و جہد ہے:

آن یکی در عہد داؤدِ نبی — نزد ہر دانا و پیش ہر غبی
این دعا میکرد دایم کای خدا — ثروتی بی رنج روزی کن مرا
چون مرا تو آفریدی کاہلی — زخم خواری سست جنبی منبلی
بر خران پشت ریش بی مراد — بار اسبان و اشتران نتوان نہاد

کاہلم چون آفریدی ای ملی | روزیم ده ہم ز راہِ کاہلی
کاہلم من سایہ خسپم در وجود | خفتم اندر سایۂ احسان وجود
کاہلان و سایہ خسپان را مگر | روزی بنہادہ ای نوعی دگر
ہر کہ راہ پاہست جوید روزیی | ہر کہ را پا نیست کن دلسوزیی
رزق را می ران بسوی این حزین | ابر را باران بسوی ہر زمین
چون زمین را پا نباشد جودِ تو | ابر را راند بسوی او دُو تو
طفل را چون پا نباشد مادرش | آید و ریزد وظیفہ بر سرش
روزیی خواہم بناگہ بی تعب | کہ ندارم من ز کوشش جز طلب[۲۱۱]

دفتر سوم ہی میں ایک برگزیدہ شخصیت دقوقیؒ اور ان کی کرامات وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ یہ داستان کئی حصوں میں بیان ہوئی ہے۔ ایک جگہ ان کا یہ واقعہ مذکور ہوا ہے کہ چند لوگ سمندر کے کنارے نماز پڑھنے اور دقوقی ان کی امامت کرانے میں مصروف ہیں۔ اچانک ایک کشتی بھنور میں پھنس کر ڈوبنے لگتی ہے اور اہلِ کشتی اپنے بچاؤ کے لیے زور زور سے رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس شور فغاں سے دقوقی کی توجہ ادھر پھر جاتی ہے۔ وہاں قیامت کا سماں ہوتا ہے۔ لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر دقوقی کے دل میں ان کے لیے رحم و شفقت کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے، اور وہ ان کی نجات کی خاطر حضورِ حق سراپا دعا بن جاتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں ادا کی گئی اس دعا میں دعا کنندہ کی رقّت و خشوع کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ ہر چند یہ دعا بھی دوسرے آدمی کی زبان سے ادا ہوئی ہے لیکن موقع و محل ایسی ہی رقت و خضوع کا متقاضی تھا اور مولانا نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ دراصل جیسا کہ دعا کے الفاظ سے پتا چلتا ہے، شروع میں مولانا نے دقوقی کی زبان سے اہلِ کشتی ہی کے لیے دعا مانگی ہے لیکن بعد میں دعا کا انداز عمومی ہو گیا ہے اور مولانا اہلِ کشتی کے بہلانے گویا ساری ملّت کی طرف سے نجات و بخشش کے لیے دعا میں مصروف ہو گئے ہیں۔

اس دعا میں اللہ جل جلالہٗ کی ذاتِ اقدس کو اعلیٰ و عظیم کہہ کر اہلِ کشتی کے افعال و اعمال سے

---

۲۱۱ کتاب مثنوی، ص ۲۳۰

درگزر اور اُن کی دست گیری فرمانے کی التجا کی گئی ہے۔ پھر گزارش ہوتی ہے کہ اے اللہ! یہ کائنات اور اس کی ہر شے تیری قدرت مطلقہ کے قبضے میں ہے انھیں بخیر و خوبی کنارے پر پہنچا دے۔ اپنی ازلی رحیمی و کریمی کے صدقے ان کی بُرائی اور بدخواہی پہ نہ جا۔ تو نے ہماری لغزشوں اور خطاؤں کے باوصف ہمیں ہمارے حق سے زیادہ عطا فرمایا اور کسی معاوضے عوضانے کے بغیر ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ جس قدر تیری ذات صاحبِ عظمت و جلالت ہے، اسی قدر ہمارے گناہ عظیم وکثیر ہیں۔ ہماری نجات و بخشش تیرے ہی ہاتھ میں ہے ... اس دعا میں بھی مولانا نے دقوقی کی زبان سے اس فلسفے کو دہرایا ہے کہ دعا کی تعلیم بھی خدا ہی نے دی ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم نے حرص اور لالچ کی آگ میں خود کو جلا ڈالا ہے، اور یہ جو ہم تیرے حضور ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں تو یہ طریقہ بھی تو نے ہی ہمیں بتایا ہے، اسی تعلیم دعا کے صدقے میں، جس کی بنا پر تاریکیاں چھٹ گئیں اور روشنیاں پھیل گئیں، ہماری دست گیری اور رہنمائی فرما اور ہمارے گناہ معاف اور ہماری مشکلیں آسان فرما دے۔

چھٹے دفتر میں کسی طالبِ گنج فقیر کی داستان بیان ہوئی ہے، جسے اپنی بے صبری اور تعجیل کے سبب ندامت و پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس داستان کے ایک حصے میں ایک فقیر کی مختصر سی دعا دی گئی ہے کہ میں اپنی اس عجلت سے توبہ کرتا ہوں اور چونکہ تیری ہی ذاتِ اقدس نے در بند کیا ہے تو تو ہی اب اُسے وا فرما۔ پھر انسان کے آلودۂ ما سوا ہونے، دعا کرنے میں بے ہنر اور اپنے خطاکار و گناہ گار ہونے وغیرہ کا اعتراف ہے۔ رات کے وقت نیند کے غلبے سے، جسے موت کے مشابہ قرار دیا گیا ہے، انسان کی جو حالت ہوتی ہے مولانا اسے مختلف تمثیلات و تشبیہات سے واضح کرتے ہیں۔ پھر رات اور دن کی آمد کے منظر کی نہایت دلکش تصویر کشی کرتے ہوئے انھوں نے سحر کے وقت خدائے بزرگ و برتر کے حضور انسانوں کی دعا و مناجات اور تسبیح و تہلیل کا ذکر کیا ہے۔ شب علامت ہے آفات و ظلمات کی۔ شب کو نہنگِ آسمانی کہہ کر گویا اس کی ہولناکی ظاہر کی ہے۔ آفات سے نجات کے سلسلے میں مولانا رومی نے حضرت یونس علیہ السلام کی قرآنی تلمیح سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ سحر طلوع ہونے پر ہر کوئی اللہ کے حضور دست بدعا ہوتا اور اس کے رحم و کرم کی بھیک مانگتا ہے، چشمِ تیز، گوشِ باز (کھلے کان) اور جسمِ مُبک کی تمنا کرتا ہے تاکہ ان کی بدولت وہ کفر و ضلالت اور آفات و ظلمات کی چیرہ دستیوں سے خود کو محفوظ رکھ سکے، اور ظاہر ہے ان حالات میں صرف اسی ذاتِ باری کا دامنِ رحمت تھامنے سے انسان کی نجات ممکن ہے۔

مولانا بار بار دیدۂ بینا کی دعا کرتے ہیں تاکہ اس کی بدولت گناہ اور ثواب، اور خوب اور بد کی پہچان ہو سکے۔ اس ضمن میں مولانا نے پھر ایک قرآنی تلمیح (ساحرانِ دربارِ فرعون اور حضرت موسیٰ سے متعلق) پیش کی ہے۔ ساحروں نے دربارِ فرعون میں حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھا تو ہر قسم کے خوف سے بے پروا ہو کر یہ کہہ دیا تھا کہ ہم ربِ موسیٰ و ہارون پر ایمان لاتے۔ مولانا کا استدلال یہ ہے کہ ربِ جلیل کی طرف سے دیدۂ بینا عطا ہونے پر انھیں یہ مقام حاصل ہوا ورنہ اس سے قبل وہ گویا اندھے تھے۔ یہ کہہ کر مولانا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا ذکر اور بگڑی بنانے کی دعا کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ دو ایک دعاؤں میں حضرت آدم کی توبہ کا حوالہ دے آئے ہیں، یہاں پھر کہتے ہیں کہ یہ دعا بھی خود خدا ہی نے انسان کو اولِ آفرینش سے سکھائی ہے ورنہ اس خاکی و فانی کی کیا مجال جو اس ذاتِ گرامی سے یوں مخاطب ہو سکتا ـــــ وہ رحمتِ خداوندی کو جوش میں لانے کے لیے اس دعا کو "تیری اپنی دعا" کہہ کر اُسے قبول فرمانے کی التجا کرتے ہیں:

هر یکی گوید بهنگام سحر	چون ز بطنِ حوتِ شب آید بدر
کای کریمی کاندر این لیل وحش	گنج رحمت بنهی و چندین چشش
چشم تیز و گوش بازو تن سبک	از شب همچون نهنگ ذوالحبک
از مقاماتِ وحش روزین سپس	هیچ نگریزیم ما با چون تو کس
ما نمی خواهیم غیر از دیدهٔ	دیدهٔ تیزی، گشی، بگزیدهٔ
بعد ازین ما دیده خواهیم از تو بس	تا نپوشد بحر را خاشاک و خس
ساحران را چشم چون رست از عمی	کف زنان بودند بی این دست و پا
ای بکرده یار هر اغیار را	ای بداده خلعت گل خار را
خاک ما را ثانیاً پالیز کن	هیچ نی را بار دیگر چیز کن
این دعا تو امر کردی ز ابتدا	ورنه خاکی را چه زهرهٔ این ندا
چون دعامان امر کردی ای عجاب	این دعای خویش را کن مستجاب

مثنوی رومی میں بعض دیگر مقامات پر بھی چند دعائیں بیان ہوتی ہیں جو بڑی عمدہ ہیں۔